سلسلہ مطبوعات 4

قرآنی اصول معاشیات

(مع ترتیب جدید)

مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ

شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن

سلسلہ مطبوعات (4)

قرآنی اصولِ معاشیات

(مع ترتیب جدید)

مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ

زیرِ اہتمام

شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن

نام پمفلٹ	....	قرآنی اصول معاشیات
مؤلف	....	مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ
ترتیب جدید	....	مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری
سلسلہ مطبوعات نمبر	....	4
سن اشاعت طبع اوّل	....	دسمبر/1990ء
سن اشاعت دوم	....	جولائی/2005ء
سن اشاعت سوم	....	اپریل/2021ء(ترتیب جدید)
زیرِ اہتمام	....	شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن، ملتان
قیمت	....	

ملنے کا پتہ:

☆رحیمیہ ہاؤس، 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور

PH:00-92-42-36307714 , 36369089

برائے خط و کتابت:

☆پوسٹ بکس نمبر 938، پوسٹ آفس گلگشت، ملتان

ابتدائیہ

دورِ حاضر میں دنیا جس معاشی بحران میں مبتلا ہے، اس سے کسی باشعور شخص کو انکار نہیں ہوسکتا۔ اگرچہ متمدن اقوام نے اپنی سوچ کی بنیاد پر مختلف معاشی نظام نہ صرف وضع کیے، بلکہ ان کو عمل کے میدان میں سے بھی گزارا۔ لیکن ابھی تک ان میں سے کوئی ایسا نظام سامنے نہیں آسکا، جسے انسانیت کی مکمل فلاح و بہبود کا ضامن قرار دیا جاسکے۔ سرمایہ داری روبہ زوال ہے۔ وہ اپنے بنیادی اصولوں میں ترمیم و تنسیخ اور دیگر ذرائع سے اپنے آپ کو بچانے کی آخری جدوجہد میں ہے۔ اسی طرح اشتراکی نظام بھی ہلچل سے دوچار ہے۔ اس کے اساسی نظریات کی عمارتیں زمین بوس ہورہی ہیں۔ اور ان کی جگہ نئے نظریات کی آبیاری ہورہی ہے۔ ایسے میں قرآنِ حکیم جیسی لازوال کتاب شعوری نظروں کی مرکز توجہ ہے کہ جس کے الفاظ چودہ صدیوں میں اپنی تابانی اور شوکت نہ کھو سکے۔ تو اس کے معانی و مفاہیم اور مقاصد تو کس قدر اپنے اندر استقلال رکھتے ہوں گے کہ لباس کے مقابلے میں وجود اور جسم کے مقابلے میں روح کی پائیدار حیثیت مسلّم ہے۔ اسی کتاب مبین نے دیگر شعبہ ہائے حیات کی طرح معاشیات میں لازوال اصول متعین کیے ہیں، جن پر حدیث وفقہ کی روشنی میں ایک انقلابی اور عوامی فلاح و بہبود پر مبنی

پائیدار نظام قائم کیا جاسکتا ہے۔ان اصولوں کی انقلابی توضیح و تشریح جمعیت علمائے ہند کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ (تلمیذ رشید حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ وخلیفہ ومجاز حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ و فیض یافتہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ) نے معاشیات پر اپنی کتاب ''اسلام کا اقتصادی نظام'' میں کی ہے۔

درجِ ذیل مقالہ مولانا سیوہارویؒ کی اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری صدر نشین خانقاہ عالیہ رحیمیہ رائے پور نے اس کے حوالہ جات کی جدید تخریج وعناوین اوراضافوں کے ساتھ اس کی نئی ترتیب دی ہے، اس مقالے کے مطالعے سے علمِ معاشیات کے بنیادی قرآنی اصول سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ان اصولوں کی روشنی میں اسلام کے اقتصادی اور معاشی نظام کا ایک مکمل خاکہ سامنے آجاتا ہے۔اللہ تعالیٰ اسے سمجھنے اور اس کے مطابق اپنا ملکی نظام قائم کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین!

شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن قرآنی اصول معاشیات کی مستقل اشاعت کی سعادت حاصل کررہی ہے۔تاکہ نوجوان نسل نہ صرف دینی شعور سے بہرہ ور ہو، بلکہ علمائے حق کے گراں قدر انقلابی خیالات سے بھی مستفید ہو۔

ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن

چیئرمین: شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن

مضامین ایک نظر میں

مضامین ایک نظر میں

☆

صالح معاشی نظام کی ضرورت اور اہمیت

کائناتِ ہست و بود (زندگی) میں ''ایک صالح معاشی نظام'' کی اس لیے ضرورت پیش آتی ہے کہ ہر ایک انسان میں یہ فطری جذبہ موجود ہے کہ اس کو خدائے تعالیٰ کی بخشی ہوئی زندگی سے فائدہ اُٹھانا چاہیے، مگر یہ انفرادی جذبہ جب زندگی کی کش مکش اور وسائلِ حیات کی کشاکش میں ایک دوسرے سے ٹکراتا ہے تو قانونِ فطرت جو کہ خداتعالیٰ کی جانب سے تمام کائنات پر حاوی ہے، ہر ایک انسان کو اجتماعی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ لیکن یہ حیاتِ اجتماعی بغیر کسی ایسے نظام کے متصور نہیں ہوسکتی جب تک ان کے درمیان ایسا تعاون واشتراک موجود نہ ہو، جس کی بنیاد عدل اور حقِ معیشت کی مساوات پر قائم ہو، تاکہ وہ ''صالح معاشی نظام'' کے لیے کلید بن سکے۔ اور اس قسم کا تعاون واشتراک جب ہی عالمِ وجود میں آسکتا ہے کہ نظامِ معاشیات میں حسبِ ذیل اصول کارفرما ہوں:

1۔ وہ نظام ہر متعلقہ فرد کی معاشی زندگی کا کفیل ہو اور اپنے دائرہ عمل میں کسی بھی فرد کو معاشی زندگی سے محروم نہ رکھتا ہو۔

2۔ ایسے اسباب وسائل کا قلع قمع (خاتمہ) کرتا ہو جو معاشی دست بُرد (لوٹ مار) کا موقع مہیا کرکے افرادِ انسانی کے درمیان ظلم واستبداد کی راہیں کھولنے اور معاشی نظام کے فساد کا موجب بنتے ہوں۔

3۔ دولت اور اسبابِ دولت کو کسی خاص فرد یا محدود جماعت کے اندر سمٹ آنے اور اس فرد یا جماعت کو نظامِ معیشت پر قابض ومسلط ہونے سے باز رکھتا ہو، تاکہ معاشی نظام تمام کائناتِ انسانی کی فلاح کے بجائے مخصوص طبقوں کے اَغراض کا آلۂ کار بن کر نہ رہ جائے۔

4۔ محنت اور سرمایہ کے درمیان صحیح توازن قائم کرتا اور ایک دوسرے کی حدود پر غاصبانہ دست بُرد سے بچاتا ہو۔

اسلام کے معاشی نظام کے فوائد وثمرات

تجربہ اس بات کا شاہد ہے کہ ''جدید علمی دور'' میں من جملہ دیگر علوم وفنون کے ''علم المعیشت'' کو بھی بڑی حد تک ایک علم وفن کی حیثیت حاصل ہے اور بڑے بڑے علمائے یورپ و ایشیا نے اس پر ضخیم تصانیف پیش کی ہیں، لیکن اس تمام ایں وآں اور چنیں و چناں (بحث ومباحثہ) کے باوجود ''علم المعیشت'' کا اصل مقصد ___ یعنی عام رفاہیت (آسودگی) وخوش حالی ___ آج تک عنقا بنی ہوئی (ناپید) ہے۔ اور دولت وذرائع دولت سب سمٹ کر ایک مخصوص طبقے کے ہاتھ میں اس طرح آگئے ہیں کہ عام انسانی آبادی کے لیے زندگی ''موت'' سے زیادہ بھیانک بن گئی ہے۔ بہ خلاف اُس دور ___ دورِ نبوتؐ ودورِ خلافتِ راشدہ ___ کے، وہاں معیشت کی یہ علمی اور فنی موشگافیاں اگرچہ عنقا تھیں، مگر عام خوش حالی اور رفاہیت کا یہ عالم تھا کہ بلالحاظ مسلم وکافر، مومن ومشرک، مرد وعورت، صغیر و کبیر اور اَجیر ومستاجر (چھوٹا وبڑا اور محنت کش اور اس کو حق محنت ادا کرنے والا) سب ہی امن واطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے اور معیشت میں فارغ البال تھے۔ تاریخ اس بات کا مواد فراہم کرتی ہے کہ:

> ''اس دور میں ایک وقت، مملکتِ اسلامیہ کے اندر ایسا آیا کہ لوگ صدقات کے مال کو لیے پھرتے تھے، مگر اس کا قبول کرنے والا ہاتھ نہ آتا تھا۔''(1)

معاشی نظام کا اصل منشا اور مقصد

علاوہ ازیں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ دنیا میں کوئی کام بغیر کسی منشا اور محرک کے وجود پذیر نہیں ہوتا اور ہر عمل کی پشت پر ایک خاص ذہنیت کار فرما ہوتی ہے۔ پس کسی ''معاشی نظام'' کے صالح اور فاسد ہونے کا معیار بھی اس کے محرکات اور اس کے منشا کے صالح اور فاسد ہونے پر موقوف ہے۔ سو اگر اس کی پشت پر فاسد ذہنیت کام کر رہی ہے اور اس کے محرکات سر تا سر فاسد ہیں تو بلاشبہ وہ نظام ''فاسد نظام'' ہے۔ اور اگر اس کی پشت پناہی ایک صالح ذہنیت کر رہی ہے اور اس کے تمام تر محرکات صالح اور اس کا منشا

خیر ہے تو اس نظام کے صالح ہونے میں پھر کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

اس اصول کے پیشِ نظر جب ہم ''معاشی نظام'' پر گہری نظر ڈالتے اور فکرِ عمیق (گہری سوچ) سے کام لے کر جانچتے ہیں تو اس کے محرکات ومنشا یا اس سے متعلق ذہنیت کو صرف دو صورتوں میں محدود پاتے ہیں:

1۔ ایک یہ کہ ''معاشی نظام'' کو اس لیے قائم کیا جائے کہ اس کے ذریعے سے زیادہ سے زیادہ نفع کمایا جائے اور اس کو لین دین اور سودے کی اسپرٹ میں رکھا جائے، تاکہ هَلۡ مِن مَّزِيدٍ[2] (مزید چاہیے) کا نعرۂ نفع بازی اور فائدہ طلبی کسی حد پر بھی جاکر ختم نہ ہوسکے۔ یہ نظریہ ''سرمایہ دارانہ نظام'' کا بانی اور مؤسس ہے اور اسی کے زیرِ اثر یہ نظام پھلتا پھولتا ہے۔ ''فورڈ کمپنی''[3] کا مالک کروڑ پتی اور ارب پتی ہونے کے باوجود بھی مارکیٹ میں (ذاتی) ترقی اور اضافے ہی کا خواہش مند رہتا ہے۔ کیوں کہ وہ معاشی نظام کے جس ماحول میں جدوجہد کر رہا ہے، اس کی بنیاد زیادہ سے زیادہ نفع کمانے اور سودے بازی پر قائم ہے۔ اور یہ صرف اربابِ دولت وثروت ہی کو اَور زیادہ بلند کرتا ہے اور باقی تمام انسانی آبادی کو افلاس و احتیاج سے دوچار بناتا ہے۔ یہاں رفع حاجات (بنیادی تقاضوں کو پورا کرنا) وتکمیلِ ضروریات کے محرکات کام نہیں کرتے، جو عام رفاہیت کا پیغام لائیں اور عام خوش حالی کو بحال کریں۔

2۔ دوسرے یہ کہ معاشی نظام کا محرک اور منشا نفع بازی نہ ہو، بلکہ ضروریاتِ زندگی کی تکمیل اور رفع حاجات ہو۔ اور اس کے منصۂ شہود (منظرِ عام) پر لانے کے لیے صرف یہ ذہنیت کام کر رہی ہو کہ انفرادی واجتماعی احتیاجات کو پورا کیا جائے، نہ کہ زیادہ سے زیادہ نفع کو پیشِ نظر رکھا جائے۔

معاشی نظام کے ان ہر دو محرکات یا ہر دو ذہنیتوں میں سے اسلام ایک ایسے معاشی نظام کا بانی اور مؤسس ہے کہ جس کی بنیاد صرف کائناتِ انسانی کی رفع حاجات و ضروریات اور انفرادی و اجتماعی احتیاجات کی تکمیل پر قائم ہے۔ وہ معاشیات کو دولت مندوں کے درمیان نفع کی دوڑ کا میدان نہیں بنانا چاہتا، بلکہ رفعِ حاجات وتکمیلِ ضروریات کے لیے ایک مفید اور نفع بخش ذریعہ بنا کر اس کی افادیت کو عام کرنا چاہتا

ہے۔ گویا اس نظامِ معیشت میں:

''بلا شبہ زیادہ سے زیادہ کمانے والے افراد موجود ہوں گے، کیوں کہ سعی وکسب (بھاگ دوڑ اور کمانے) کے بغیر کوئی مؤمن زندہ رہ ہی نہیں سکتا، لیکن جو فرد جتنا زیادہ کمائے گا اتنا ہی زیادہ انفاق (خرچ کرنے) پر مجبور بھی ہوگا۔ اور اس لیے افراد کی کمائی جتنی بڑھتی جائے گی، اتنی ہی زیادہ جماعت (معاشرہ) بہ حیثیت جماعت کے خوش حال ہوتی جائے گی۔ قابل اور مستعد افراد زیادہ سے زیادہ کمائیں گے۔ یہ صورت پیدا نہ ہو سکے گی کہ ایک طبقے کی کمائی دوسرے طبقوں کے لیے محتاجی و مفلسی کا پیغام ہو جائے، جیسا کہ اب عام طور پر ہو رہا ہے۔''(4)

اس تمام تر تفصیل کے بعد اَب غور کیجیے کہ جس معاشی نظام کے کُل پُرزے اس طرح ڈھالے گئے ہوں، اس کا نشوونما اور اس کی ترقی ایسے ترتیبی اجزا پر قائم ہو، جو صرف طبیعات (مادی دنیا) ہی تک آ کر نہ ٹھہر جائیں، اَخلاقی اور مذہبی محاسن (خوبیوں) کو بھی اپنی آغوش (گود) میں لیں، بلکہ مذہب اور دستورِ الٰہی کے زیرِ فرمان عالمِ وجود میں آئیں اور اس کے محرک فلاحِ دارین اور سعادتِ کائنات کے وہ اصول ہوں، جن میں معاشیات، رفعِ حاجات اور تکمیلِ ضروریات کے لیے ہو، نہ کہ زیادہ سے زیادہ سودا بازی اور نفع طلبی کے لیے تو ایسے صالح اور صحیح نظامِ معاشی کا وجود بلاشبہ دنیا کے لیے پیامِ رحمت اور دعوتِ امن وسلامتی ہے۔

الحاصل! ''اسلامی معاشی نظام'' ایسا بہتر نظام ہے، جو اپنے اندر علم المعیشت کے قدیم و جدید نظام ہائے مذہبی و عقلی کے تمام محاسن سموئے (اندر لئے) ہوئے ہے اور اس سے بھی زیادہ خوبیوں کا مالک ہے۔ اور ان کے معائب (خامیوں) و نقائص سے یکسر خالی، بلکہ ان کے مسموم (زہریلے) اثرات کا بے نظیر تریاق ہے اور ان تمام محاسن کے علاوہ اس کو یہ برتری حاصل ہے کہ وہ انسانوں کے دماغ کی اختراع نہیں ہے کہ جس کی بنیاد انتقام یا طبقاتی منافرت جیسی خام کاریوں (کمزور بنیادوں) پر رکھی گئی ہو، بلکہ وہ نظامِ کائنات کے خالق کا بتایا ہوا نظام ہے۔

قرآن حکیم کے بیان کردہ اصولِ معاشیات

یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ قرآن عزیز نے اپنی اَساسی روِش کے مطابق عبادات، معاشرتی معاملات، سیاسیات اور دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح معاشیات میں بھی صرف اساسی اصول اور معجزانہ اختصار کے ساتھ اصول وکلیات کا ہی ذکر کیا ہے۔ اور ان کی تفصیلات وتشریحات کو ارشاداتِ نبویؐ (احادیث) اور ان سے مستنبط احکامِ (فقہ) کے حوالے کر دیا ہے۔ معاشیات سے متعلق قرآنِ عزیز نے جن اساسی اصولوں کا ذکر کیا ہے، وہ یہ ہیں:

پہلا اصول: حقِ معیشت میں مساوات

رزق اور معاش کا حقیقی تعلق صرف ذاتِ الٰہی سے وابستہ ہے اور وہی ہر فرد کا کفیل (ضامن) ہے۔ اور اگرچہ اس کی مصلحتِ عام اور حکمتِ تام کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا کے اس متنوع (کئی قسموں کے) ماحول میں رزق کے اندر تفاوتِ درجات پایا جائے، لیکن امارت وغربت کے فطری تنوع (Natural Diversity) کے باوجود یہاں ایک فرد بھی محروم المعیشت نہ رہنے پائے۔ کیوں کہ اس نے حقِ معیشت کو سب کے لیے مساوی اور برابر رکھا ہے اور کسی کو بھی اس حق مساوات میں دخل انداز ہونے کا حق عطا نہیں فرمایا۔

قرآن حکیم کے دلائل سے اس اصول کا ثبوت

اللہ تعالیٰ ہر فرد کی معاشی زندگی کا کفیل ہے اور اس کا وعدہ ہے کہ زمین پر چلنے والے ہر ایک جان دار کی معیشت اس کے ذمے ہے۔ اس کے لیے حسبِ ذیل نصوصِ (آیات) قرآنیہ قابلِ مطالعہ ہیں:

(1) وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا [5]

(اور زمین پر چلنے والے ہر جان دار کے رزق کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لی ہے۔)

(2) وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ (6)

(اور تمھارا رزق اور جس شئے کا تم وعدہ دیے گئے ہو، آسمان میں (یعنی اللہ تعالیٰ کے ذمہ میں) ہے۔"

(3) وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ؕ (7)

(اور افلاس کے ڈر سے اپنی اولاد کو نہ مارڈالا کرو، ہم ہی تمھیں بھی روزی دیتے ہیں اور انھیں بھی۔)

(4) وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ (8)

(اور آسمان اور زمین سے تم کو کون روزی پہنچاتا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اَور معبود ہے؟)

(5) اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴿۵۸﴾ (9)

(بے شک اللہ تعالیٰ ہی روزی دینے والا ہے، بڑی مضبوط طاقت والا ہے۔)

(6) وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ﴿۲۰﴾ (10)

(اور ہم نے تمھارے لیے زمین میں معیشت کے سامان بنا دیے اور ان کے لیے بھی جن کو تم روزی نہیں دیتے۔)

(7) هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ق (11)

(وہ (خدا) وہ ذاتِ پاک ہے، جس نے تمھارے لیے وہ سب کچھ پیدا کیا، جو زمین میں ہے۔)

ان آیات میں بغیر کسی تخصیص کے ہر فردِ بشر کو خطاب ہے اور ان کی روح یہ ہے کہ معیشت واسبابِ معیشت خدائے تعالیٰ کے خزانۂ عامرہ (بھرا ہوا خزانہ) کی ایسی عطا و بخشش ہے کہ جس سے فائدہ اٹھانے کا ہر جان دار کو برابر کا حق ہے۔

ان (مذکورہ بالا) آیات میں (بیان کردہ) اس روح کی زیادہ وضاحت وصراحت حسبِ ذیل آیات کرتی ہیں:

(8) وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ﴿۱۰﴾ (12)

(اور رکھے اس زمین میں بوجھل پہاڑ اس (کی پیٹھ) پر اور برکت رکھی اس کے اندر اور چار دن میں اندازہ سے رکھیں اس میں ان کی خوراکیں، جو برابر ہیں حاجت مندوں کے لیے۔)

(9) وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ۭ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ۝ (13)

(اور اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری دی ہے، پھر ایسا نہیں ہوتا کہ جن کو زیادہ روزی دی گئی ہے، وہ اپنی روزی کو زیر دستوں پر لوٹا دیں، حال آں کہ اس روزی میں وہ سب کے سب برابر کے حق دار ہیں۔ پھر کیا یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے صریح منکر نہیں ہو رہے ہیں۔)

اس آیت کا ایک ترجمہ اور مطلب وہ ہے، جو اوپر بیان کیا گیا۔

(الف) اس آیت کے ایک معنی (تفسیر) ''روح المعانی'' میں یہ بھی کہے ہیں:

(اور جائز ہے کہ آیت کا معنی یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے رزق میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور جن کو فضیلت حاصل ہے، وہ اپنے رزق میں سے اپنے سے کم تر افراد کو کچھ نہیں واپس کرتے اور میں یقیناً ان کا روزی رساں ہوں۔ چناں چہ مالک اور مملوک بنیادی رزق میں مساوی ہیں، گو مقدار اور معیار میں تفاوت ہو۔

(ب) اور (تفسیر) ''کشاف'' میں اس مفہوم کو اختیار کیا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو رزق کے حوالے سے ایک دوسرے سے متفاوت بنایا ہے۔ چناں چہ تمھارا رزق، تمھارے ماتحتوں کو دیے گئے رزق سے افضل ہے، حال آں کہ وہ تم جیسے انسان اور تمھارے بھائی ہیں۔ اور یہ مناسب تھا کہ تم اپنے حاصل شدہ رزق کا زائد حصہ ان پر لوٹا دیتے، تاکہ وہ لباس اور خوراک میں مساوی ہو جاتے، جیسا کہ حضرت ابوذر غفاریؓ سے منقول ہے۔(14))

(ج) اسی طرح اس آیت کی ایک تفسیر "البحر المحیط" وغیرہ میں یہ بھی کی گئی ہے:

(ابوبکر نے روایت کیا ہے کہ عاصم، ابوعبدالرحمٰن اور اعرج کی قرأت یہ ہے: "کیا تم اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہو؟" خطاب (مخاطب کرنے) کی قرأت کے مطابق معنی یہ ہے کہ مالکان، اپنا رزق اپنے مملوک اور ماتحتوں کو نہیں لوٹاتے، بلکہ اِن کو اور اُن کو بھی میں رزق دیتا ہوں۔ تو وہ یہ گمان نہ کریں کہ وہ اِن کو کچھ دیتے ہیں۔ بلاشبہ وہ میرا رزق ہے، جس کو میں ان (مالکان) کے ہاتھوں پر (ماتحتوں کیلئے) جاری کرتا ہوں۔ اور وہ سب اس میں مساوی ہیں۔ ان کو اپنے مملوکوں پر کوئی امتیاز حاصل نہیں۔ ایسی صورت میں "معطوف علیہ" مقدر ہے (وہ جملہ جس پر اگلی بات مبنی ہے وہ عبارت میں ذکر نہیں ہے مگر مفہوم میں موجود ہے) جو اس معنی سے مناسبت رکھتا ہے۔ (آیت کے مفہوم میں) یوں کہا جاسکتا ہے کہ "وہ اس بات کو نہیں سمجھتے۔ پس وہ اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں۔(15))

ان آیات میں حق معیشت کی مساوات کا جس قدر صاف اور صریح اعلان ہے، وہ آپ اپنی مثال ہے۔ اور اس کا انکار بداہت وصراحت (بالکل کھلی اور واضح بات) کا انکار ہے: (شیخ سعدی نے خوب کہا!)

اے کریمے کہ از خزانۂ غیب — گبر و ترسا وظیفہ خور داری

دوستاں را کجا کنی محروم — تو کہ با دشمناں نظر داری

(اے معزز ذات! کہ اپنے غیب کے خزانے سے تمام کافر وآتش پرست امیر و غریب کو خود وظیفہ دیتا ہے۔

دوستوں کو آپ کیسے محروم رکھ سکتے ہیں، جب کہ آپ دشمنوں پر بھی نظرِ کرم رکھتے ہیں۔)

لیکن اَب سوال یہ ہے کہ منشائے الٰہی کے اس مقصدِ عظیم کو پورا کون کرے؟ اور اس عالمِ اسباب میں اس کی تکمیل کس کے ذمے واجب ہے؟ تو اسلام کے نظام کا مکمل نقشہ

جن نگاہوں کے سامنے ہے، وہ بہ آسانی یہ جواب دے سکتے ہیں کہ اس ''عالمِ تشریع'' (دنیوی نظام) میں یہ فریضہ نائبِ الٰہی ''خلیفہ'' پر عائد ہوتا ہے کہ قلم رو (مملکت) اسلامی میں ایک فرد بھی ایسا نہیں ہونا چاہیے، جو حقِ معیشت سے محروم ہو۔ اور نہ کسی کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ حقِ معیشت میں دراندازی (مداخلت کرنے والا) بن سکے اور جو حکومت اس منشائے الٰہی کو پورا نہ کرتی ہو وہ ''فاسد نظام'' کی حامل اور نظامِ عدل سے منحرف ہے۔

شیخ الہندؒ کا معاشی نظریہ

چناں چہ سورت البقرہ کی اس آیت:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا [16] کی تفسیر کرتے ہوئے شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ (1920ء) ارشاد فرماتے ہیں:

''جملہ اشیائے عالم (دنیا کی تمام چیزیں) بہ دلیل (اس) فرمان واجب الا ذعان (جس پر یقین رکھنا لازم ہے) تمام بنی آدم کی مِلک (ملکیت) معلوم ہوتی ہیں، یعنی غرضِ خداوندی، تمام اشیا کی پیدائش سے دفعِ حوائج جملۂ ناس (تمام انسانوں کی حاجات کو پورا کرنا) ہے۔ اور کوئی شئے فی حدّ ذاتہ (ذاتی طور پر) کسی کی مملوکِ خاص (ذاتی ملکیت میں) نہیں، بلکہ ہر شئے اصل خلقت میں (پیدائشی طور پر) جملۂ ناس (تمام انسانوں) میں مشترک ہے۔ اور مِن وَجہ (ایک طرح سے) سب کی مملوک ہے۔

ہاں! بوجہِ رفعِ نزاع (جھگڑا ختم کرنے) وحصولِ انتفاع (نفع اٹھانے کے لیے) قبضہ کو علتِ مِلک (ملکیت کا سبب) مقرر کیا گیا۔ جب تک کسی شئے پر ایک شخص کا قبضۂ تامّۂ مستقلّہ (مستقل اور پورا قبضہ) باقی ہے، اس وقت تک کوئی اَور اس میں دست درازی نہیں کر سکتا۔

ہاں! خود مالک و قابض کو چاہیے کہ اپنی حاجت سے زائد پر قبضہ نہ رکھے، بلکہ اس کو اَوروں (دوسروں) کے حوالے کر دے۔ کیوں کہ بہ اعتبارِ اصل (بنیادی طور پر) اَوروں (دوسروں) کے حقوق اس کے ساتھ متعلق ہو رہے ہیں۔

یہی وَجہ ہے کہ مالِ کثیر، حاجت سے بالکل زائد جمع رکھنا بہتر نہ ہوا، گو زکوٰۃ بھی ادا کر دی جائے۔ انبیاؑ وصلحا اس سے بہ غایت مجتنب (انتہائی پرہیز کرتے) رہے۔ چناں چہ احادیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، بلکہ بعض صحابہؓ و تابعینؒ وغیرہ نے حاجت سے زائد رکھنے کو حرام ہی فرما دیا۔ بہر کیف غیر مناسب وخلافِ اولیٰ (مستحب نہ) ہونے میں تو کسی کو کلام ہی نہیں۔

اس کی وَجہ یہی ہے کہ **زائد علی الحاجۃ** (ضرورت سے زائد مال) سے اس کی تو کوئی غرض متعلق نہیں۔ اور اَوروں (دوسروں) کی مِلک مِن وجہ (ایک پہلو سے ملکیت) اس میں موجود۔ تو گویا شخص مذکور مِن وجہ مالِ غیر (ایک لحاظ سے دوسرے کے مال) میں قابض ومتصرف (عمل دخل دینے والا) ہے۔

اس کا حال بعینہٖ مالِ غنیمت (میدان جنگ میں دشمن سے حاصل کردہ مال) کا سا تصور کرنا چاہیے۔ وہاں بھی قبل تقسیم، یہی قصہ ہے کہ مالِ غنیمت تمام مجاہدین کا مملوک سمجھا جاتا ہے، مگر بہ وَجہ ضرورت وحصولِ انتفاع بہ قدرِ حاجت، ہر کوئی مالِ مذکور سے منتفع (فائدہ اٹھا) سکتا ہے۔ ہاں! حاجت سے زائد جو رکھنا چاہے اس کا حال آپ کو معلوم ہے کہ کیا ہونا چاہیے (یعنی خائن شمار ہوگا)۔"(17)

احادیثِ نبویہ ﷺ سے اس اصول کا ثبوت

مشہور محدث ابنِ حزم ظاہریؒ نے اس سلسلے میں "محلّٰی" میں جو روایات نقل کی ہیں، وہ بھی اسی کی تائید کرتی ہیں:

(1) حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا: "جس شخص کے پاس قوت و طاقت کے سامان اپنی حاجت سے زائد ہوں، اس کو چاہیے کہ فاضل سامان کو کمزور کو دے دے۔ اور جس شخص کے پاس سامانِ خورد ونوش حاجت سے زائد ہو، اس کو چاہیے کہ فاضل سامان نادار اور حاجت مند کو دے دے۔"

حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ: نبی اکرمؐ اسی طرح مختلف انواعِ مال کا

ذکر فرماتے رہے، حتیٰ کہ ہم نے یہ گمان کرلیا کہ ہم میں سے کسی شخص کو اپنے فاضل مال پر کسی قسم کا کوئی حق نہیں ہے۔(18)

اور ابو سعید خدریؓ کی روایت پر بحث کرتے ہوئے علامہ ابن حزم فرماتے ہیں:

(اس پر صحابہؓ کا اجماع ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ اس اجماع کی خبر دے رہے ہیں اور جو کچھ اس حدیث میں ہے، ہم بھی یہی کہتے ہیں۔(19)

کہ اگر کوئی شخص بھوکا ننگا، یا ضروریاتِ رہائش سے محروم ہے تو مال دار کے فاضل مال سے اس کی کفالت کرنا فرض ہے۔ تمام ائمہ مجتہدین کا بھی یہی مسلک ہے۔

(2) حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا: ''جس بات کا مجھے آج اندازہ ہوا ہے، اگر اس کا پہلے سے اندازہ ہو جاتا تو میں اس میں کبھی تاخیر نہ کرتا اور بلا شبہ اربابِ ثروت کی فاضل دولت لے کر فقرا اور مہاجرین میں بانٹ دیتا۔''(20)

ابنِ حزمؒ اس روایت کی سند پر حکم لگاتے ہوئے فرماتے ہیں:

(یہ سند نہایت صحیح اور پر از جلالت (عظمت) ہے۔)

(3) حضرت ابو عبیدہؓ اور تین سو صحابہ رضی اللہ عنہم سے یہ روایت صحت کو پہنچی ہے کہ ان کے کھانے پینے کا سامان ختم ہو رہا تھا۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے حکم دیا کہ جس جس کے پاس جس قدر موجود ہے، اس کو حاضر کرے۔ پھر سب نے اپنے اپنے سامان کو دو توشہ دانوں میں جمع کیا اور حضرت ابو عبیدہؓ اس سب کو سب میں برابر تقسیم کرتے تھے۔''(21)

(4) محمد بن علی (محمد بن الحنفیہ) سے روایت ہے کہ انھوں نے (اپنے والد) حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہٗ کو فرماتے ہوئے سنا کہ: ''اللہ تعالیٰ نے مال داروں کے اموال پر ان کے فقرا کی حاجت کو بہ قدرِ کفایت پورا کرنا فرض قرار دیا ہے۔ پس اگر وہ بھوکے ننگے یا معاشی تکلیف میں مبتلا ہوں گے، اس لیے کہ مال دار اپنا حق ادا نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ کو اس بات کا حق ہے کہ ان سے قیامت کے دن حساب لے اور اس پر انھیں عذاب

دے۔(22)

اسی قسم کی دوسری احادیث اور آیاتِ قرآنی کو دلیل میں پیش کرتے ہوئے مشہور محدث ابنِ حزم ظاہریؒ (اپنی کتاب "المحلّٰی" میں) یہ مسئلہ (نمبر 725) تحریر فرماتے ہیں:

(اور ہر ایک ایسی بستی کے اربابِ دولت کا فرض ہے کہ وہ فقرا اور غربا کی معاشی زندگی کے کفیل ہوں اور اگر مالِ فئے (بیت المال کی آمدنی) ان غربا کی معاشی کفالت کو پوری نہ ہوتی ہو تو سلطان (امیر) ان اربابِ دولت کو اس کفالت کے لیے مجبور کرسکتا ہے (یعنی ان کے فاضل مال سے بہ جبر (بذریعہ قانون) لے کر فقرا کی ضروریات میں صرف کرسکتا ہے)۔ اور ان کی زندگی کے اسباب کے لیے کم از کم یہ انتظام ضروری ہے کہ ان کی ضروری حاجت کے مطابق روٹی مہیا ہو۔ پہننے کے لیے گرمی اور سردی دونوں موسموں کے لحاظ سے لباس فراہم ہو۔ اور رہنے کے لیے ایک ایسا مکان ہو، جو ان کو بارش، گرمی، دھوپ اور سیلاب جیسے امور سے محفوظ رکھ سکے۔(23)

اَب ان تمام نصوصِ قرآنی اور ان کی مؤید احادیث و فقہی روایات کو سامنے رکھ کر بہ نظر انصاف غور فرمایئے کہ "اسلام کا معاشی نظام" حقِ معیشت کی مساوات کا کس طرح صاف اور واضح اعلان کرتا ہے۔ اور امیر اسلام (اسلامی ریاست کی مقتدرہ) کے اختیارات میں وسعت دے کر اس کی حفاظت کے لیے کس قدر عادلانہ دستور قائم کرتا ہے۔

غربت و امارت سے متعلق ایک شبہ کا جواب

جو دماغ اسلامی نظام کے حقائق سے نا آشنا اور موجودہ فاسد نظام ہی کو ___ جس میں امارت و غربت کا قابلِ نفرت حد تک تفاوت نظر آتا ہے ___ اسلامی نظام سمجھتے ہیں، ان کے لیے یہ باتیں بلاشبہ حیرت زا ہیں۔ ان میں سے بعض تو اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے، منشائے الٰہی کے خلاف ہے۔ کیوں کہ خدا تعالیٰ نے جب خود ہی لاکھوں کروڑوں انسانوں کو محروم المعیشت پیدا کیا ہے اور غربت و امارت کا یہ فرق بھی کہ

___ ایک کروڑ پتی ہے اور دوسرا نانِ جویں (جو کے آٹے کی روٹی) سے بھی محروم ___ اسی کا بنایا ہوا ہے، تو پھر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ حقِ معیشت میں تمام افرادِ انسانی مساوی ہیں اور یہ کہ کوئی فرد اس کائنات میں محروم المعیشت نہ رہے؟

بعض اس گمراہی میں ہیں کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے، اسلامی نظام کو ہمہ گیر ثابت کرنے کے لیے ایک جدید کوشش ہے، جو دنیا کے رُجحانات اور وقت کے تقاضوں کے سامنے سپر (ہتھیار) ڈالتے ہوئے احکامِ الٰہی کی ترمیم و تبدیل کی شکل میں پیش کی جا رہی ہے، یا اشتراکیت و اشتمالیت (سوشلزم اور کمیونزم) سے مرعوب ہو کر (اسلام کو) قبائے مارکسزم کے جسم پر موزوں کیا جا رہا ہے، لیکن افسوس اور صد افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ دونوں خیالات، وَساوِس اور اوہامِ فاسدہ (بے بنیاد توہمات) سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ در حقیقت یہ نتیجہ ہے اس عام بے خبری کا، جو اسلامی تعلیم کے متعلق مسلم فضا میں ابرِ محیط (پھیلے ہوئے بادل) کی طرح چھائی ہوئی ہے۔ یہ ثمرہ ہے اپنے حقائق سے یکسر ناآشنا رہتے ہوئے اس مرعوبیت کا، جو مغربی (نوآبادیاتی) تعلیم کی بہ دولت ہم پر طاری و ساری ہے۔

عالمِ تکوین اور عالمِ تشریع کا فرق

یہ دونوں خیالات، وسوسہ یا سفسطہ (مغالطہ) کیوں ہیں؟ اس لیے کہ ہم اس قسم کے مسائل پر بحث کرتے وقت اسلام کی اس بنیادی حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ "عالمِ تکوین" اور "عالمِ تشریع" میں کیا فرق ہے؟ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جس قانونِ الٰہی کو کائنات کی کامرانی کا واحد حل تجویز فرمایا ہے، ذی عقل کائناتِ عالم (انسانوں) کو جس کے امتثال (پورا کرنے) کی تکلیف دی ہے، اور جس کی تعمیل (عمل کرنے) کے لیے مکلّف (ذمہ دار) بنایا ہے، اس کا تعلق تکوینیات سے ہے، یا تشریعیات سے؟ سو اگر ہم اس بنیادی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیتے تو بلا شبہ اس قسم کے وساوس اور اوہام کی صورت ہی پیدا نہ ہوتی۔

اللہ تعالیٰ کا تکوینی نظام

یہ ایک حقیقت ہے کہ خالقِ کائنات نے کائنات کے آغاز و انجام کا جو تکوینی نظام بنایا

ہے، اس کا تمام تر تعلق صرف اپنی ذاتِ احدیت (یکتا ذات) ہی کے ساتھ رکھا ہے۔ اس میں کسی دوسرے کے دخل کی مطلقاً گنجائش نہیں ہے اور نہ ہم کو یہ معلوم ہے کہ نظامِ تکوینی میں کسی شئے کے لیے کیا ہے اور کیا نہیں اور نہ اس علم کا ہم کو مکلّف بنایا گیا ہے۔ اس کا تعلق سر تا سر "عالمِ تکوین" سے متعلق ہے۔

انسانیت کے لیے تشریعی نظام

البتہ اس نے حضرتِ انسان کو جب کہ عقل و شعور اور ادراک و تمیز عطا فرمائے ہیں تو اس عطا و بخشش کے بعد اس کو یوں ہی بے کار اور معطل نہیں چھوڑ دیا، بلکہ اشیا کے حسن و قبح (خوبی و ناخوبی) اور اپنی مرضیات و نامرضیات (پسندیدہ اور ناپسندیدہ) کی معرفت اور ہدایت و گمراہی اور حق و باطل میں امتیاز کے لیے، نیز افراد کو اجتماعی سِلک (سلسلہ) میں منسلک کرنے کے لیے ایک بہترین "نظام" عطا فرمایا اور اس میں اچھی اور بُری دونوں راہوں کو واضح کر دیا۔ (ارشادِ خداوندی ہے:)

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (24)

(اور ہم نے اُسے دونوں راہوں کی رہنمائی کر دی۔)

اس نظام کا نام نظامِ تشریعی ہے اور کائنات میں "پہلے انسان" کے ساتھ ساتھ یہ "نظام" عالمِ تشریع پر حاوی ہے اور انبیا و رُسل کے ذریعے برابر (مسلسل) دنیائے انسانی پر کار فرما رہا ہے اور اس کی فلاح و بہبود کا ضامن و کفیل ہے۔ پس یہی وہ نظام ہے کہ جب حدِ کمال کو پہنچا تو "قرآن عزیز" کی شکل میں جلوہ افروز ہوا۔

پس اگر یہ بنیادی حقیقت ہمارے پیشِ نظر رہے تو ہم بہ آسانی یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارے دائرے سے یہ باہر ہے کہ ہم "نظامِ تکوینی" سے بحث کریں، بلکہ ہم صرف "نظامِ تشریعی" (قانونِ تشریع) ہی کے دائرے میں محدود رہ کر بحث کر سکتے ہیں۔

اَب قرآنِ عزیز سے نقل شدہ نصوص (آیات) کو ملاحظہ فرمائیے اور غور کیجیے کہ کیا ان نصوص کی مراد یہ ہے کہ چوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مصلحتِ عامہ اور حکمتِ بالغہ (عمومی مصلحت اور مکمل حکمت) کی بنا پر کائناتِ انسانی میں امارت و غربت کے تفاوتِ درجات کو

خلق (پیدا) کیا ہے، اس لیے مردِ مؤمن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس تفاوتِ درجات کو ترقی دینے کے لیے ایسا نظام قائم کرے کہ تمام ثروت و دولت امیروں کے ہاتھ میں آجائے اور کروڑوں انسان فقیر اور محتاج بن کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جانِ آفریں کو جان سپرد کردیں اور اس طرح ''العیاذ باللہ'' (اللہ کی پناہ) منشائے الٰہی کو پورا کریں؟

اگر ان آیاتِ قرآن کا مطلب یہ نہیں ہے (اور یقیناً نہیں) تو پھر اس کے سوائے دوسرا کیا مطلب ہوسکتا ہے کہ درجاتِ معیشت میں فطری حد تک تفاوت کے باوجود حق معیشت میں تمام کائناتِ انسانی، مساوی اور برابر کی شریک ہے اور کسی صاحبِ ثروت کی دولت و ثروت غریبوں کی غربت میں اضافہ کرنے کے لیے نہیں ہے، بلکہ خدا تعالیٰ کی وہ امانت ہے جو اجتماعی نظام کے زیرِ فرمان غربا و مساکین کی غربت و مسکنت کو فنا کرنے کے لیے استعمال ہونی چاہیے۔ گویا صاحبِ ثروت کی ثروت، غربا کی غربت کے لیے رحمت ثابت ہو، نہ کہ زحمت۔

اور اگر اربابِ ثروت ایسے عادل سسٹم کو منظور نہ کریں اور اس پر عمل پیرا نہ ہوں تو پھر خدا کے نائب (خلیفہ) کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے ''اجتماعی معاشی نظام'' کے مطابق اربابِ ثروت کو قانوناً اس پر مجبور کرے۔ اور اگر بیت المال کا مالیہ (بجٹ اس کے لیے) کافی نہ ہو اور اس سے بھی قلم روِ خلافت میں محروم المعیشت (معاشی ضروریات سے محروم) انسان موجود رہ جائیں تو اہلِ دولت کے سرمائے سے بہ جبر (قانونی طریقہ سے) حاصل کر کے ''حقِ معیشت کی مساوات'' کو بروئے کار لائے، خواہ وہ اہلِ دولت اپنے مال میں سے تمام ''عائد شدہ مالی فرائض و حقوق'' ادا کر چکے ہوں۔

الحاصل! قرآنی نصوص اور ان کی مؤید احادیث رسول ﷺ اور ان سے مستنبط (اخذ شدہ) فقہی احکام یہ واضح کرتے ہیں کہ ''حقِ معیشت کی مساوات'' کا یہ نظریہ، منشائے الٰہی کے خلاف نہیں، بلکہ عین منشائے الٰہی کے مطابق ہے اور یہ جدید نظریہ نہیں ہے کہ مارکسزم کی حمایت یا اس سے مرعوبیت کی بنا پر احکامِ اسلامی کی انوکھی تعبیر کے ذریعے وجود میں آیا ہو، بلکہ اسلام کا وہ بنیادی اور اساسی حکم ہے، جو اپنے وجود سے آج تک غیر متبدل اور غیر متزلزل رہا ہے۔ اور اگر ہم نے اس کو سمجھنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی، یا دوسرے

انسانوں کے اختراعی معاشی نظاموں سے مرعوب ہو کر ہم نے ''اسلامی معاشی نظام'' کو یکسر بھلا دیا تو اس میں اپنا قصور ہے، نہ کہ اسلامی نظام کے بیان کرنے والے اور اس کی اصل حقیقت سے روشناس کرانے والے کا۔

یہ بھی سخت گمراہی ہے کہ ہم یہ یقین کر بیٹھے ہیں کہ غربت و امارت کا یہ غیر فطری تفاوت اور ظالمانہ امتیاز جو آج ہم کو کائنات پر چھایا ہوا نظر آتا ہے، خدا کا بنایا ہوا ہے، بلکہ یہ ''فاسد نظام ہائے معاشی'' کے ثمرات و نتائج ہیں اور خدا کی مرضی یہ ہے کہ اس قسم کے تمام نظام ہائے فاسد کو یک قلم سوخت (ختم) ہو جانا چاہیے۔

حقِ معیشت میں مساوات کا اصول اور خلفائے راشدینؓ: (اضافہ از مرتب)

حق معیشت میں مساوات کا اصول خلفائے راشدینؓ کے طرزِ فکر و عمل سے بھی واضح ہوتا ہے۔ چناں چہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں احادیث میں آتا ہے کہ انھوں نے اپنے عہدِ خلافت میں بیت المال سے مال کی تقسیم کے وقت تمام لوگوں کو برابر اور مساوی طور پر اموال دیے۔ ان اموال کی تقسیم کے اعداد و شمار یہ ہیں کہ ایک بار 7.1/3 درہم اور دوسری بار 20 درہم سب کو ملے۔ (ایک درہم تقریباً 3 گرام چاندی کے مساوی تھا) چناں چہ ''کتاب الخراج'' میں قاضی ابو یوسفؒ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دورِ خلافت کے بارے میں لکھا ہے:

> (حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بیت المال کے بقیہ مال کو لوگوں کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کر دیا۔ ہر ایک چھوٹے اور بڑے، آزاد اور غلام، عورت اور مرد کو سات درہم اور ایک درہم کا تہائی حصہ مساوی طور پر ہر انسان کو دیا۔ جب دوسرا سال آیا اور پہلے سے زیادہ مال بیت المال میں آیا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اُسے بھی لوگوں کے درمیان اسی اصول پر تقسیم کیا۔ چناں چہ ہر انسان کو بیس درہم مساوی طور پر ملے۔(25)

اس پر کچھ لوگ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس آئے اور انھوں نے کہا کہ:

> (اے رسول اللہؐ کے خلیفہ! آپ نے یہ مال لوگوں کے درمیان مساوی طور پر

تقسیم کیا ہے، حال آں کہ کچھ لوگ ایسے ہیں، جن کی قدیم خدمات ہیں، دینی کاموں میں سبقت لے جانے والے ہیں اور فضیلت رکھنے والے ہیں۔ کاش کہ آپ ان لوگوں کو کچھ زیادہ عنایت فرماتے۔(26)

چناں چہ صحابہؓ میں سے ایسے صحابی بھی ہیں، جنھوں نے بدر میں خدمات سرانجام دیں۔ بدر سے لے کر اب تک اُن کی محنتیں ہیں اور کچھ وہ لوگ ہیں، جو فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے۔ کچھ لوگ ہیں، جو ابھی مسلمان ہوئے۔ آپ نے سب کو برابر کر دیا۔ قاضی ابو یوسف نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کا یہ جواب نقل کیا ہے۔ انھوں نے ارشاد فرمایا:

(یہ جو تم نے سبقت لے جانے والے قدیم اور صاحبِ مرتبہ لوگوں کا ذکر کیا ہے، یہ ایسا ہے کہ میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ یہ ایک ایسا کام ہے، جس کا ثواب اللہ جل شانہٗ پر (کے پاس) ہے۔ (جب کہ) یہ معاشیات کا معاملہ ہے۔ اس میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے سے مساوات بہتر ہے۔(27)

صاحبِ فضل و احسان کے کاموں کا اس دنیا میں اس کا کوئی معاوضہ نہیں ہے کہ غزوۂ بدر میں زیادہ خدمات سرانجام دیں۔ گویا مطالبہ کرنے والوں نے یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ مال داروں کو مزید ملنا چاہیے اور غریبوں کو کم ملنا چاہیے۔ بلکہ اُن کا مطالبہ یہ تھا کہ جنھوں نے غلبہ دین کے لیے خدمات زیادہ انجام دی ہیں، اُن کی حوصلہ افزائی کے لیے اُن کو کچھ زیادہ ملنا چاہیے۔ تو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کہا کہ یہ معاشیات کا معاملہ ہے، اس میں معاشی مساوات کے قانون پر عمل ہوگا۔

حضرت عمر فاروقؓ کا دور آیا تو انھوں نے اسلام کے لیے زیادہ خدمات سرانجام دینے والوں کو ترجیح دی اور انھیں بیت المال سے زیادہ مال عطا کیا، لیکن آخری زمانے میں انھوں نے بھی معاشی مساوات کے قانون پر عمل کرنے کا عزم اور ارادہ ظاہر کیا۔ چناں چہ قاضی ابو یوسفؒ لکھتے ہیں:

(جب حضرت عمرؓ نے مال کی کثرت کو دیکھا تو ارشاد فرمایا کہ: ''اگر میں آئندہ سال آج کے دن تک زندہ رہا تو میں ضرور پیچھے رہ جانے والے لوگوں کو پہلوں کے ساتھ شامل کر دوں گا، یہاں تک کہ تمام لوگ بیت المال کی عطا حاصل

کرنے میں مساوی ہوجائیں۔(28)

گزشتہ تمام قرآنی آیات اور احادیث سے حقِ معیشت میں مساوات کا قانون واضح ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی مملکت کے قدرتی اور جمع شدہ ملکی قومی وسائل اور اموال پر اُس سوسائٹی میں بسنے والے تمام انسانوں کا مساوی حق ہے۔ گویا ''پیدائشِ دولت'' میں حصہ لینے کے لیے ملکی قومی دولت کو استعمال کرنے کا تمام لوگوں کو حق ہے۔ کسی خاص طبقے کی اجارہ داری نہیں ہے۔ پھر اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق ان قومی اور قدرتی وسائل میں محنت و مشقت کر کے اشیا میں افادیت پیدا کریں گے۔ انسانی محنتوں اور صلاحیتوں کے تفاوت سے فطری طور پر درجاتِ معیشت میں فرق ہوسکتا ہے۔ درجاتِ معیشت میں فطری تفاوت ہونے کی صورت میں بھی زیادہ کمانے والے لوگوں پر بالکل نہ کما سکنے والوں اور محتاجوں کا حق بھی ہے۔ زکوٰۃ اور دوسرے فرائضِ مالیہ ادا کرنے کے باوجود بھی عام انسانوں کی ضروریات نہ پوری ہو رہی ہوں تو حکومت کا فرض ہے کہ زیادہ کمانے والوں سے مال لے کر لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنے کا اہتمام کرے۔ (مرتب)

دوسرا اصول: درجاتِ معیشت میں فطری تفاوت

اگرچہ حقِ معیشت میں سب مساوی ہیں، لیکن درجاتِ معیشت میں مساوی نہیں ہیں۔ معیشت میں درجات کا تفاوت ایک حد تک فطری ہے، یعنی یہ ضروری نہیں کہ سب کے لیے سامانِ معیشت ایک ہی طرح کا ہو، لیکن یہ ضروری ہے کہ ہو سب کے لیے۔ مگر درجات کا یہ تفاوت ایسے اعتدال پر قائم رہے کہ کسی حالت میں بھی وہ لوگوں کے درمیان وجہِ ظلم نہ بن سکے۔ یعنی تفاوتِ درجات (فرق) تو ہو، لیکن نہ ایسا کہ ''معیشت'' انسانوں کو دو طبقوں میں اس طرح تقسیم کردے کہ ایک کی ترقی دوسرے کے فقر و افلاس کا سبب بنے اور دوسرا پہلے کے معاشی اغراض کا آلہ کار بن کر رہ جائے۔

قرآن عزیز نے اس تفاوتِ درجات کو اس طرح بیان کیا ہے:

(1) نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ

بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ ۝ (29)

(دُنیوی زندگی میں ہم نے لوگوں کی معیشت ان کے درمیان تقسیم کر دی ہے اور اس کو اس طرح کر دیا کہ بعض کو دوسرے بعض پر معیشت میں بلندی حاصل ہے)

(2) اَللّٰهُ يَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيَقۡدِرُ ؕ (30)

(اللہ جس کے لیے چاہتا ہے، رزق میں فراخی دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگی (محدود کر) ڈالتا ہے)

(3) وَهُوَ الَّذِىۡ جَعَلَكُمۡ خَلٰٓـئِفَ الۡاَرۡضِ وَرَفَعَ بَعۡضَكُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبۡلُوَكُمۡ فِىۡ مَاۤ اٰتٰٮكُمۡ ؕ (31)

(اور وہی ہے، جس نے تمھیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور بعض کو بعض پر مرتبے دیے، تاکہ اس نے جو کچھ تمھیں دیا ہے، اس میں تمھیں آزمائے)

(4) وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعۡضَكُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ فِى الرِّزۡقِ‌ ۚ فَمَا الَّذِيۡنَ فُضِّلُوۡا بِرَآدِّىۡ رِزۡقِهِمۡ عَلٰى مَا مَلَـكَتۡ اَيۡمَانُهُمۡ فَهُمۡ فِيۡهِ سَوَآءٌ ‌ؕ اَفَبِنِعۡمَةِ اللّٰهِ يَجۡحَدُوۡنَ ۝ (32)

(خدائے تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری دی۔ پھر ایسا نہیں ہوتا کہ جس کسی کو زیادہ روزی دی ہے، وہ اپنی روزی سے اپنے زیر دستوں کو لوٹا دے۔ حال آں کہ اس روزی میں سب برابر کے حق دار ہیں۔ پھر کیا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے صریح منکر نہیں ہو رہے؟)

گویا رزق میں تفاوتِ درجات کی مصلحت ایک خاص قسم کی آزمائش پر مبنی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ایک جانب غنی کو صاحبِ ثروت بنا کر اس سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی ثروت کو تنہا اپنی ملکیت نہ سمجھے، بلکہ "انفرادی ملکیت کے باوجود" یہ یقین رکھے کہ وہ جس قدر زیادہ کمائے گا، اسی قدر اس کی دولت پر اجتماعی حقوق زیادہ عائد ہوں گے۔ پس وہ صرف اپنے لیے نہیں کماتا، بلکہ جماعت کے دوسرے افراد کے لیے بھی کماتا ہے۔

تفاوتِ درجات کا درست مفہوم

نیز یہ ذہن نشین رہے کہ درجات کا یہ تفاوت، جماعت کے دوسرے افراد کو محروم

المعیشت (معیشت سے محروم) بنانے اور ذاتی اغراض کی خاطر معاشی دست بُرد کرنے کے لیے نہیں ہے۔ جو ایسا کرتا ہے، وہ خدا کی نعمت (عطائے مال وثروت) کا جاحد (منکر) ہے۔ کیوں کہ یہاں دولت وسرمایہ کا مقصد زیادہ سے زیادہ نفع بازی نہیں ہے، بلکہ انفرادی حاجات وضروریات کے ساتھ ساتھ اجتماعی حاجات وضروریات کی تکمیل ہے۔

دوسری جانب غیر متموّل (مال دار نہ ہونے والے) سے یہ توقع کرتا ہے کہ وہ متموّل افرادِ ملت کے تموُّل (مال داری) کو دیکھ کر خدا کے ساتھ کفران اور ناشکر گزاری نہ اختیار کرے اور نہ حسد وبغض کو دل میں جگہ دے، بلکہ طمانیتِ قلب کے ساتھ اپنی مختصر فارغ البالی اور خوش حالی پر شاکر رہے۔ — لفظ ''فارغ البالی'' اس لیے کہا گیا ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت میں کسی فرد کا محروم المعیشت رہنا ناجائز ہے — یا پھر عملی جدوجہد میں آگے بڑھ کر اپنی استعداد و صلاحیت کے مطابق ان تمام حقوقِ معیشت سے متمتع ہو(فائدہ اٹھائے) اور غنا و دولت حاصل کرے، جن کو تمام مخلوقِ خدا کے لیے عام اور مساوی کر دیا ہے۔ وہ دوسرے افرادِ ملت کے حقوق اور ان کی ذمہ داریوں کو اپنے حاصل کردہ مال پر اسی طرح عائد کرے، جس طرح قانونِ اسلامی نے دوسرے اربابِ دولت پر عائد کیے ہیں۔

(معاشیات کے پہلے اصول ''حقِ معیشت میں مساوات'' کے تحت جب قدرتی اور ملکی وسائل میں تمام انسانوں کو استفادے کا حق ہے اور اُس میں وہ دولت کی پیدائش کے لیے یکساں طور پر محنت و جدوجہد اور کوشش کریں گے تو محنتوں اور صلاحیتوں کے فرق و امتیاز کی وَجہ سے دوسرے اصول کے مطابق درجاتِ معیشت میں فطری فرق ہوسکتا ہے۔ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسا ماحول پیدا کرے کہ جس میں تمام لوگوں کی محنت محفوظ ہو۔ اُن کے تمام حقوق کی ادائیگی اور بہتر ماحول فراہم کرنے کی ذمہ داری حکومت ادا کرے۔ اس طرح لوگوں کے درمیان معیشت میں درجات کا فرق اور امتیاز فطری حد تک ہوسکتا ہے۔ معاشی درجات میں ایسا تفاوت کہ جس کے نتیجے میں طبقاتی نظام وجود میں آئے اور سرمایہ پرست لوگ دوسروں کی محنتوں کا استحصال کرتے ہوں، درست نہیں ہے)

(مرتب)

تیسرا اُصول: اِحتکار و اِکتناز کی حرمت

دولت اور سرمایہ داری کے وہ اصول قطعاً ناقابلِ تسلیم ہیں جن میں ''احتکار'' (ضروریات زندگی کے اسباب کی ذخیرہ اندوزی) و ''اکتناز'' (زر کی ذخیرہ اندوزی) کی کوئی صورت بھی بن سکے اور ان سے دولت وکنز (خزانہ) پھیلنے اور تقسیم ہونے کے بجائے سمٹ کر خاص حلقوں اور مخصوص طبقوں میں محدود ہو کر رہ جائے۔ اس طرح عام انسانی زندگی کو مفلوک الحال بنا دے۔

احتکار و اکتناز کی حرمت اور ''انفاق'' کے وجوب کے لیے ذیل کی آیات قابلِ توجہ ہیں:

(1) وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (33)

(اور جو لوگ خزانہ بنا کر رکھتے ہیں سونے اور چاندی کو اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، سو اُن کو دردناک عذاب کی خوش خبری دے دو! جس روز کہ اس مال پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی۔ پھر اس سے داغی جائیں گی ان کی پیشانیاں، پہلو اور ان کی پیٹھ (اور کہا جائے گا) یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے واسطے گاڑ (جمع) رکھا تھا اور چکھو مزہ اپنے گاڑنے کا۔)

(2) كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَاۗءِ مِنْكُمْ ۭ (34)

(فقرا و مساکین، قرابت داروں اور یتیموں وغیرہ پر اللہ نے جو خرچ کرنے کا یہ طریقہ بتایا ہے، اس لیے ہے) تا کہ ایسا نہ ہو کہ مال و دولت صرف دولت مندوں ہی میں محدود ہو کر رہ جائے۔

(3) اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاۗءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (35)

(صدقات اَور کسی کے لیے نہیں ہیں، صرف فقیروں کے لیے اور مسکینوں کے لئے اور ان کے لیے جو صدقات کے وصول کرنے پر مامور ہیں، اور ان کے لیے جن کے دلوں میں کلمہ حق کی اُلفت پیدا کرنی ہے، اور ان کے لیے جن کی گردنیں (غلامی سے) آزاد کرانی ہیں، اور قرض داروں کے لیے جو کہ قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں، اور اللہ کی راہ میں صَرف کرنے کے لیے (یعنی مجاہدین اور اعلائے کلمۃ اللہ میں مصروف رہنے والوں کے لیے) اور مسافروں کے لیے، یہ اللہ کی جانب سے ٹھہرائی ہوئی بات ہے۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔)

(4) وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ﴿٤٣﴾ (36)

(اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو!)

(5) وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴿٧٣﴾ (37)

(اور ہم نے ان (انبیا علیہم السلام) کی جانب وحی کی، نیک کاموں کے کرنے کی اور نماز قائم کرنے کی اور زکوٰۃ دینے کی اور وہ ہمارے عبادت گزار تھے۔)

(6) وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ (38)

(اور جو ہم نے تم کو دیا ہے، اس میں سے اس سے پہلے ہی خرچ کرلو کہ تم میں سے کسی کے پاس موت آموجود ہو۔)

(7) وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ (39)

(اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو (یعنی اِنفاق فی سبیل اللہ سے رُکنا خود کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔)

ان آیات میں ادائے زکوٰۃ وصدقات اور "**اِنفاق فی سبیل اللّٰہ**" (اللہ کے راستے میں خرچ کرنے) کا حکم دیا گیا ہے اور قرآن حکیم میں بہت بڑا ذخیرہ ان ہی احکام کی ترغیب و ترہیب، ان سے متعلق احکام اور تفصیلات پر مبنی ہے۔ ان سب (احکام) کی روح یہ ہے کہ دولت و ثروت جمع و ذخیرہ کے لیے نہیں ہے، بلکہ صَرف

وخرچ کے لیے ہے۔ اس کا مصرف ذاتی و انفرادی تعیش کے بجائے انفرادی و اجتماعی ضروریات کی کفالت ہے۔

احتکار و اکتناز کی حقیقت ؛ جمہور علما کا مؤقف

اسی لیے ان آیات کی تفسیر میں ''جمہور'' (اکثر علماء) کا مسلک یہ ہے کہ جس مال میں سے زکوٰۃ اور دوسرے مالی فرائض ادا نہ کیے گئے ہوں تو وہ مال احتکار و اکتناز کی فہرست میں شامل اور (آیتِ قرآنی میں بیان کردہ) ''کنز'' (دولت جمع کرنے) سے متعلق وعید کا مصداق ہے۔ اور اسی قسم کی دولت وثروت کا نام ''سرمایہ داری'' ہے اور یہ حرام اور باطل ہے اور تباہ کردینے کے قابل۔

اور اپنی ضروریات اور اہل و عیال کی ''حاجاتِ اصلیہ'' (بنیادی ضروریات زندگی) اور مالی فرائض و واجبات کے ادا کے بعد بھی دولت باقی بچے تو اس کا پس انداز کرنا اگرچہ جائز ہے، مگر خلافِ اولیٰ ہے (پسندیدہ نہیں)۔ کیوں کہ اب اس مال پر اجتماعی حقوق عائد ہو چکے ہیں اور اب اس کو اجتماعی حاجات میں صَرف ہونا چاہیے۔ مصارف کے موقع پر ہم نے جگہ جگہ لفظِ ''حاجات'' کے ساتھ ''اصلیہ'' کا اضافہ کیا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ وہ تمام اخراجات و مصارف نظامِ اسلامی میں غیر معتبر اور باطل ہیں، جو اس کی نگاہ میں ممنوع یا حرام ہیں۔

احتکار و اکتناز کے بارے میں حضرت ابوذر غفاریؓ کا مؤقف

جمہور کے خلاف حضرت ابوذر غفاریؓ اور بعض علمائے اسلام اس کو بھی جمع کر کے رکھنا حرام بتاتے ہیں۔

چناں چہ علامہ ابن کثیرؒ اُن کا مسلک بیان کرتے ہوئے ''تفسیر ابنِ کثیر'' میں لکھتے ہیں:

> (حضرت ابوذر غفاریؓ کا مذہب یہ تھا کہ اہل وعیال کے نفقہ سے زیادہ روپیہ جمع رکھنا قطعاً حرام ہے۔ وہ اسی کا فتویٰ دیتے، اسی کی تبلیغ کرتے، اور اسی کا سب

کو حکم دیتے۔(40)

اور ان آیاتِ زکوٰۃ وصدقات اور منع احتکار واکتناز کے علاوہ آیاتِ میراث اور قانونِ وراثت بھی اسی حقیقت پر مبنی ہے کہ دولت وثروت جمع وذخیرے کے لیے نہیں ہے، بلکہ تقسیم اور پھیلنے کے لیے ہے، تاکہ اس کا افادہ زیادہ سے زیادہ وسیع ہو سکے۔

چوتھا اصول: سرمایہ ومحنت میں عادلانہ توازن

قرآنی نقطہ نظر سے معیشت کا چوتھا اصول، فاسد نظامِ معیشت کا انسداد اور سرمایہ اور محنت میں عادلانہ توازن قائم کرنا ہے۔ خرید وفروخت اور لین دین کے معاملات میں کوئی ایسا معاملہ جائز نہیں، جس سے فاسد نظامِ معیشت بروئے کار آئے، یا اس کو کسی قسم کی بھی اعانت پہنچے، یا محنت اور معیشت کے لیے جائز جدوجہد بے حقیقت ہو کر رہ جائے اور اس طرح محنت اور سرمایہ کے درمیان اعتدال اور توازن باقی نہ رہے۔ اسی لیے اس نے رِبٰو (سود) کے ہر قسم کے تجارتی کاروبار، قمار (جوا) کی تمام ظاہری وخفی، اقسام و اصناف، احتکار و اکتناز کی تمام اشکال (صورتیں) اور اسی طرح کے عقودِ فاسدہ (درست شرائط کو نظر انداز کر کے کئے جانے والے مالی معاملات) کی دوسری تمام صورتوں کو ناجائز اور مردود قرار دیا اور معاملات کے کسی شعبہ میں بھی ''فاسد معاشیات'' کو دخیل اور بروئے کار نہیں آنے دیا اور دوسرے شعبوں کی طرح معاملات کے اس شعبے میں بھی عدل وانصاف ہی کو اساس و بنیاد قرار دیا ہے:

چناں چہ (قرآن حکیم کی) حسبِ ذیل تصریحات اس کی شاہد ہیں:

(1) وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ (41)

(اللہ نے خرید و فروخت کے معاملات کو حلال کیا ہے اور سودی کاروبار کو حرام کر دیا ہے۔)

(2) يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ (42)

(اللہ تعالیٰ سودی کاروبار کو مٹاتا ہے اور صدقات وخیرات کو ترقی دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی ناشکر گزار گناہ گار کو دوست نہیں رکھتا۔)

(3) اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ (43)

(بے شک شراب، جوا، بت اور پانسے ناپاک ہیں، کارِ شیطان ہیں، پس ان سے بچو!)

(4) وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ (44)

(خرابی ہے کمی کرنے والوں کے لیے۔ ان لوگوں کے لیے کہ جب ماپ تول کرلیں تو لوگوں سے تو پورا پورا بھرلیں اور جب ان (دوسروں) کو ماپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا کر دیں۔)

(5) وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۝ (45)

(اور تول کر دو برابر وزن کے ساتھ!)

(6) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (46)

(اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل (ناجائز طریقہ) سے نہ کھاؤ، ہاں اگر آپس کی رضا مندی سے تجارت ہو تو اس طرح کھا سکتے ہو (گویا ہر شخص اپنے حصے کے مطابق اپنا حق لے۔)

اسلام کا اقتصادی نظام؛ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی نظر میں

چناں چہ حضرت شاہ ولی اللہ (دہلوی نور اللہ مرقدہ) ”حُجّةُ اللّٰه البالغه“ میں اسی اساسی اصول کی روشنی میں ”باب من أبواب ابتغاء الرّزق“ کے عنوان سے حسبِ ذیل نہایت پُر شوکت اور مدلل مضمون تحریر فرماتے ہیں:

1۔ محنت کی عظمت واہمیت

”یہ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب مخلوق کو پیدا کیا اور زمین میں ان کی معاشی حیات کے لیے سب کچھ سامان فراہم کر دیا اور ان سب کو سب کے لیے مباح اور عام کر

دیا تو ان سے متمتع ہونے میں مخلوقات کے درمیان مزاحمت اور مناقشت (تنازعہ) شروع ہوگئی۔ تب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ:

(الف) جب کوئی شخص (محنت و مشقت کے ذریعہ) سبقت اور پہل کر کے کسی (قدرتی) شئے کو اپنے قبضے میں کرلے،

(ب) یا مورث (جس کی وراثت تقسیم ہو،اسی نے محنت کی اور اس) کے قبضے کی وَجہ سے اس (وارث) کی وراثت میں آجائے،

(ج) یا ان کے علاوہ ایسے دوسرے طریقوں سے اس کا قبضہ ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک جائز طریقے قرار پاچکے ہیں تو ایسی صورت میں اب کسی دوسرے شخص کو اس کی (حاصل کردہ) مقبوضہ شئے میں مزاحمت کا حق نہیں ہے۔ البتہ دوسرے کی مقبوضہ شئے کو حاصل کرنے کا جائز طریقہ یہ ہے کہ:

(i) یا خرید و فروخت اور لین دین کے ذریعے تبادلے کی شکل پیدا کرے،

(ii) یا معتبر طریقوں سے باہمی رضامندی کا معاملہ اس طرح انجام پاجائے کہ ہر دو جانب میں اس کے متعلق صحیح علم ہو اور اس معاملے میں نہ اِلتباس (دونوں طرف سے کوئی اُلجھاؤ) اور دھوکے کا دخل ہو، اور نہ خلط ملط کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔

2۔ اجتماعی اور معاشی زندگی میں تعاونِ باہمی کی اہمیت

نیز جب کہ انسان مدنی الطبع (فطری طور پر اجتماعیت پسند) واقع ہوئے ہیں تو ان کی معاشی زندگی باہمی تعاون و اشتراک کے بغیر ناممکن ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے تعاون اور باہمی اشتراکِ عمل کو واجب کر دیا اور یہ بھی لازم قرار دیا کہ کسی فرد کو بھی ایسے امور سے کنارہ کش ہونے کا حق حاصل نہیں ہے، جو تمدن میں دخیل (شامل) ہیں، مگر یہ کہ کسی شخص کو بعض مجبور کن حالات ایسا کرنے پر مجبور کر دیں (تو عذر ہوسکتا ہے)۔

3۔ معیشت کے حصول کے بنیادی اسباب؛ زراعت، تجارت اور صنعت

نیز اسبابِ معیشت کے ''اسباب'' بننے میں اصل الاصول یہ ہے کہ:

(الف) اموالِ مباح (قدرتی وسائل) میں سے کسی شئے کو اپنے قبضے میں لیا جائے،
(ب) یا ان اموالِ مباح کے وسیلے سے جو کہ (محنت کر کے) مالی ترقی کا ذریعہ بنا کرتے ہیں، اپنے مقبوضہ اور مشخّصہ (متعین) مال کو ترقی دی جائے۔ مثلاً:
(i) چرائی (کی محنت) کے ذریعے سے چوپایوں کی افزائشِ نسل کرنا،
(ii) یا زمین کی درستی اور پانی کی سیرابی کے ذریعے سے زراعت و کاشت کاری کرنا،
لیکن مالِ مباح (قدرتی اشیا) کو اپنے لیے خاص کرنے یا دوسرے مباح اموال کو اپنے مال کی ترقی کا ذریعہ بنانے میں شرطِ اوّلین یہ ہے کہ یہ تصرفات اس طرح عمل میں نہ آنے پائیں کہ ایک فرد دوسرے فرد کے لیے معاشی ذرائع کی تنگی اور ضیق (دباؤ) کا باعث بن جائے اور اس طرح تمدن کو فاسد اور برباد کر دے۔''(47)

یعنی جب کہ حلال وسائلِ معاش سب کے لیے یکساں طور پر مباح الاصل (اصل میں سب کے لیے جائز) ہیں تو اب کسی شخص کو اپنی شخصی (ذاتی) معاش کے لیے اسی قدر اس میں تصرف اور دعویٰ ملکیت جائز ہے کہ اس کا یہ عمل دوسروں کی معاشی زندگی کی پریشانی کا باعث نہ بن جائے اور اس کی دولت مندی دوسروں کے افلاس اور فقر و فاقہ کا سبب نہ ثابت ہو۔

(امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ مزید فرماتے ہیں:)

''پھر یہ بات بھی پیشِ نظر رہنا ضروری ہے کہ اگر ''معاشی معاملات'' میں لوگوں کے درمیان باہمی تعاون و اشتراکِ عمل کے ذریعے مالی ترقی و نمود (بڑھوتری) بروئے کار نہ آئے تو تمدن کا صالح اور صحیح رہنا دشوار سے دشوار تر ہو جائے گا:

(الف) مثلاً ایک چاہتا ہے کہ وہ تجارتی مال کو ایک شہر سے دوسرے شہر میں لے جائے اور ایک معین مدت کے لیے وہ اس ایاب و ذہاب (آنے جانے) کی گارنٹی چاہتا ہے (یعنی تجارت کو ذریعہ معاش بناتا ہے)۔
(ب) یا مثلاً ایک دوسرا شخص اپنی عملی جدوجہد کے ذریعے دوسروں کے مال (کو فروخت کرنے) کی سہولت کاری (Sale) کرتا ہے (یعنی محنت کو ذریعۂ معاش بناتا ہے۔
(ج) یا ایک تیسرا شخص اپنی نئی نئی پسندیدہ ایجادات کے ذریعے دوسروں کے مال کو

بیش قیمت اور بہتر بناتا ہے (یعنی صنعت وحرفت کو وسیلہ معاش بناتا ہے)

(د) اور اس طرح دوسرے جائز طریقے اختیار کرتا ہے

(تو ان سب صورتوں میں تعاون کے بغیر معاشی زندگی میں استواری پیدا نہیں ہو سکتی)۔

بہر حال ان تمام معاملات میں صحیح تعاون واشتراکِ عمل ضروری اور واجب ہے۔

4۔مجبور محنت کش کی رضامندی، حقیقی رضامندی نہیں ہوتی

اگر یہ مالی ترقی ایسے طریقے سے کی جائے کہ اس میں سِرے سے تعاون کا کوئی دخل ہی نہ ہو:

(الف) جیسا کہ قمار (جوا) کا کاروبار ہے،

(ب) یا ایسے طریقہ سے عمل میں آئے کہ بہ ظاہر تو تعاون نظر آتا ہو، لیکن حقیقت میں وہ زبردستی کا تعاون ہو، حقیقی تعاون نہ ہو۔ جیسا کہ مثلاً رِبا (سود) کا کاروبار ہے۔

تو یہ بات بہت صاف ہے کہ ایک مفلس اور نادار اپنی معاشی پریشانیوں کی وَجہ سے اپنے ذمہ ایسی ذمہ داریوں کو لینے کے لیے مضطر ومجبور ہو جاتا ہے، جن کو پورا کرنے کی اپنے میں طاقت نہیں پاتا اور اس کی اس قسم کی رضامندی ہرگز رضامندی نہیں کہلائی جاسکتی۔

لہذا اس طرح کے کاروبار نہ پسندیدہ اور نہ ہی جائز معاملات کہلائے جاسکتے ہیں اور نہ ان کو معاشیات کے اسبابِ صالحہ (جائز ذرائع) کہا جاسکتا ہے۔ بلاشبہ اس قسم کے تمام معاملات، حکمتِ تمدن کی نگاہ میں باطل اور ظلم ہیں۔"(48)

ولی اللّٰہی معاشی تعلیمات کے بنیادی نکات

حضرت شاہ (ولی اللہ) صاحبؒ کی اس عبارت سے صرف اس آخری اصول ہی پر روشنی نہیں پڑتی، بلکہ اصول چہارگانہ (۱۔حقِ معیشت میں مساوات، ۲۔ درجاتِ معیشت میں فطری تفاوت، ۳۔ احتکار واکتناز کی ممانعت، ۴۔ سرمایہ اور محنت میں عادلانہ توازن) کی ایک جامع اور مبسوط تفصیل سامنے آجاتی ہے، یعنی:

1۔ حق معیشت میں برابری

معیشت میں فطری تفاوتِ درجات کے باوجود تمام مخلوق یکساں اور برابر ہے، یعنی حقِ معیشت میں برابر ہے۔ اور خدا تعالیٰ نے تمام معاشی وسائل میں زمین اور پیداوارِ زمین کو سب کے لیے مباح الاصل (بنیادی طور پر جائز) پیدا کیا ہے۔ اور تعیین و تشخیص، جائز قبضے سے ہی وجود میں آتی ہے۔

2۔ معاشی تنگی پیدا کرنا ناجائز ہے

کسی فرد کو ان اموالِ مباح میں اسی قدر اور اسی طریق سے قبضہ وتصرف جائز ہے کہ اس سے دوسرے فرد کے لیے معاشی ضیق (تنگی اور دباؤ) کے اسباب پیدا نہ ہو جائیں۔

3۔ تعاونِ باہمی ضروری ہے

نیز معاشی معاملات میں ''باہمی تعاون واشتراکِ عمل'' واجب اور ضروری ہے۔

4۔ صحیح طریقوں پر تعاونِ باہمی جائز ہے

اور یہ تعاون ایسے صحیح اور سالم (محفوظ) طریقوں پر مبنی ہونا چاہیے کہ اس سے نظامِ تمدن میں ابتری نہ پھیل جائے، یعنی ان کے ذریعے معاشی معاملات میں ایک دوسرے کو مدد ملے، نہ کہ ایک کا فائدہ دوسرے کی مضرت (اور نقصان) پر موقوف ہو۔

5۔ صالح معاشی نظام، خدا کا حکم ہے

یہ جب ممکن ہے کہ کائنات میں ایک ''صالح معاشی نظام'' موجود ہو، جو خدائے تعالیٰ کے حکم اور منشا کو پورا کرتا ہو۔

6۔ تعاونِ باہمی کے بغیر تمام معاملات ناجائز ہیں

پس اس ''صالح معاشی نظام'' میں وہ تمام معاملات ناجائز اور حرام ہیں، جن میں تعاونِ باہمی کا مطلق دخل ہی نہ ہو، بلکہ ایک فرد کی تباہی اور مضرت پر جو دوسرے فرد کی مالی منفعت کا مدار ہو، جیسا کہ قمار (جوا) خواہ وہ غیر مہذب طریقوں سے عمل میں آئے، یا سٹہ اور لاٹری وغیرہ مہذب طریقہ ہائے تجارت کے ذریعے سے ہو۔

7۔ معاملات میں زبردستی کا تعاون اور رضامندی ناجائز ہے

وہ معاملات بھی ناجائز اور حرام ہیں، جن میں بہ ظاہر اگرچہ باہمی رضامندی اور تعاون نظر آتا ہو، لیکن اس کی تہہ میں زبردستی کے سوا اَور کچھ نہ ہو۔ جیسا کہ مثلاً ربو (سودی لین دین) اور ایسے تمام اجارات و معاملات (اجرتی اور لین دین کے معاملات) جن میں ایک جانب سرمایہ دار کا ''سرمایہ'' ہے اور دوسری جانب ایک مفلس و نادار کی (مجبوری اور اضطراری ضرورت ہو۔ سرمایہ دار مفلس کے افلاس اور اس کی اضطراری حاجت سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اجارہ، رہن (اجرت اور گروی رکھنے) اور دوسرے معاملاتِ لین دین میں اس سے ایسی شرائط منظور کرالیتا ہے، جو انصاف اور عدل کی نگاہ میں کسی طرح جائز نہیں تھیں، مگر مفلس کے افلاس اور ضرورت مند کی ضرورت نے ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور کردیا۔

8۔ ایک مخصوص طبقے کی اجارہ داری ناجائز ہے

پس اس قسم کے تمام معاملات اگرچہ باہمی رضامندی سے بھی طے پاجائیں، تب بھی اسلام اور خدائے کائنات کے نزدیک باطل اور ظلم ہیں۔ اور ''صالح معاشی نظام'' میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ خواہ ان کے ظاہری فائدے کتنے ہی خوش گوار کیوں نہ ہوں۔ اس لیے کہ اس قسم کے کاروبار کا آخری نتیجہ عوام کی فلاکت (بدحالی) و افلاس اور ایک مخصوص طبقے کی اجارہ داری کے سوا اَور کچھ نہیں ہے۔ اس لیے:

(الف) یہاں مہاجنی سود کا کاروبار (ذاتی حیثیت میں سودی کاروبار) بھی ملعون ہے۔

(ب) اور سودی بینکوں کا سسٹم بھی مذموم و مطرود (مردود) ہے۔

(ج) اور یہاں مستاجروں (اجرت پر کام لینے والوں) کے وہ تمام طریقہ ہائے تجارت بھی حرام ہیں، جن میں اجیر کے جائز اور عادلانہ اُجرت و حقوق کی حق تلفی ہو اور اس کے اضطرار اور پریشان حالی سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہو۔

(د) اجیر (مزدور) کی وہ خیانت بھی ناجائز جس سے صاحبِ سرمایہ کو ناحق نقصان

پہنچانے کی سعی کی جائے۔

اسلام کے اقتصادی نظام کی جامعیت

بہر حال ''معاشی نظام سے متعلق'' ان آیات میں قرآنِ عزیز نے جن نصوصِ قطعیہ (اپنے مفہوم میں دوٹوک آیات) کو بیان کیا ہے، اور معجزانہ بلاغت اور حکیمانہ اسلوب کے ساتھ رہنمائی فرمائی ہے، اسلام کا معاشی نظام انھی نوامیسِ الٰہی (اللہ کی کتاب اور احکامات) کی شرح وتفسیر ہے۔ یہی درحقیقت ''صالح معاشی نظام'' کے لیے بہترین دلیلِ راہ ہیں اور اس کے وجود کے ضامن اور کفیل۔

اب ان تفصیلات سے یہ بہ خوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ ''معاشی نظام'' کا جو اساسی مقصد ہے، اس کو کامیاب بنانے کے لیے ''اسلام کے اقتصادی نظام'' کے علاوہ دوسری کوئی راہ نہیں ہے۔ یہاں (اسلام کے اقتصادی نظام میں:)

(الف) مارکسزم (اشتمالیت) کی طرح مذہبی انارکی بھی نہیں ہے اور طبقاتی جنگ بھی موجود نہیں، بلکہ ایک عالمگیر اخوت کا غیر فانی اعلان ہے۔

(ب) اور سرمایہ دارانہ نظام کی طرح دولت و وسائلِ دولت کو سمیٹ کر مخصوص طبقے کے حوالے کرنا بھی حرام قرار دیا گیا ہے، تاکہ باطل اور ظلم کی بنیادیں کسی حالت میں بھی اپنے قدم نہ جما سکیں اور دنیائے انسانی کے کسی ایک فرد کو بھی اپنی معاشی حیات میں انسانوں کے ہاتھوں میں ضیق اور تنگی پیدا نہ ہو۔

اب یہ ہمارا کام ہے کہ (سرمایہ دارانہ) معاشیات کی علمی کاوشوں اور فنی بحثوں سے مرعوب ہو کر اس جال میں نہ پھنس جائیں، جس نے اَور سب کچھ تو کیا، مگر انسانی دنیا کو امن وسلامتی اور عام خوش حالی و رفاہیت سے کبھی روشناس نہ ہونے دیا اور اس طرح اپنی بدبختی پر اپنے ہاتھ سے مہر لگالی اور یا اس سادہ مگر امن وسلامتی کے شاہکار اسلام کے اقتصادی نظام کو اپنا قائد بنالیں کہ دوست اور دشمن دونوں آج تک اس کی ہمہ گیر اخوت و پیامِ مساوات اور عام معاشی خوش حالی و رفاہیت کے معترف ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات وحواشی

1۔ البدایہ والنہایہ، از علامہ ابن کثیرؒ، ج:5، ص64، طبع: بیروت۔

2۔ القرآن 30:50۔

3۔ فورڈ موٹر کمپنی 16 جون 1903ء کو امریکہ میں قائم ہوئی، جو کار، بس، ٹرک، پک اپ، ویگن، جیپ، اور تیز رفتار دوڑوں میں حصہ لینے والی گاڑیاں بناتی ہے اسی کے چالیس کے قریب ذیلی ادرے بھی کام کررہے ہیں۔

4۔ ترجمان القرآن، از مولانا ابوالکلام آزاد، ج:2، ص132، طبع: لاہور۔

5۔ القرآن 6:11۔

6۔ القرآن 22:51۔

7۔ القرآن 31:17۔

8۔ القرآن 64:27۔

9۔ القرآن 58:51۔

10۔ القرآن 20:15۔

11۔ القرآن 29:2۔

12۔ القرآن 10:41۔

13۔ القرآن 71:16۔

14۔ "و جوّز أن یکون معنی الأیة: "إنّ اللّٰہ تعالیٰ فضّل بعضاً علیٰ بعضٍ فی الرّزق." و أنّ المفضّلین لا یردّون من رزقھم علیٰ مَن دونھم شیئاً، و إنّما أنا رازقھم، فالمالک و المملوک فی أصل الرّزق سواء، و إن تفاوتا کمًّا و کیفاً.... واختار فی "الکشّاف" أنّ المعنیٰ أنّہ سبحانہٗ جعلکم متفاوتین فی الرّزق فرزقکم أفضل من ما رزق ممالیککم، و ھم بشر مثلکم و إخوانکم، و کان ینبغی أن تردّوا فضل ما رزقتموہٗ علیھم، حتّٰی تساووا فی الملبس و المطعم، کما یحکٰی عن ابی ذرّ رضی اللّٰہ عنہٗ." (روحُ المعانی فی تفسیر القرآن العظیم و السبع المثانی، سورۃ النّحل، ج:14، ص:74-273، طبع: دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان۔)

15۔ و قرأ ابوبکر عن عاصم و ابوعبدالرحمٰن و الأعرج أفبنعمۃ اللّٰہ تجحدون". و یکون المعنی علیٰ قرأۃ الخطاب أنّ المالکین لیسوا براڈی رزقھم علیٰ ممالیکھم، بل أنا الّذی أرزقھم و إیّاھم، فلا یظنّوا أنّھم یعطونھم شیئاً، و إنّما ھو رزقی أجریہ علیٰ أیدیھم، و ھم جمیعاً فی ذٰلک سواء، لا مزیّۃ لھم علٰی ممالیکھم، فیکون المعطوف علیہ المقدّر، یناسب ھٰذا المعنی، یقال لا یفھمون

ذٰلک فیجحدون نعمة اللّٰه.

(البحر المحیط، از امام ابوحیان محمد بن یوسف اندلسی غرناطی، ج:5، سورت النحل۔ وتفسیر فتح القدیر از امام محمد بن علی شوکانی، ج:3، 47-246، طبع: لجنة التحقیق و البحث العلمی بدار الوفاء۔)

16. القرآن 2:29.

17. إیضاح الادلّه، از حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، ص: 68، طبع: دیوبند۔

18. عن ابی سعید الخدریؓ أنّ رسول اللّٰه ﷺ قال: "من کان معه فضل ظهر فلیعد به علٰی من لا ظهر له، و من کان له فضل من زاد فلیعد به علٰی من لا زاد له. قال: فذکر من أصناف المال ما ذکر، حتّٰی رأینا أنّه لا حقّ لأحد منّا فی فضل."

(المُحلّٰی، از العلامه علی بن احمد الحزم، ج:6، ص: 87-157، طبع: دار الجیل، بیروت۔)

19۔ ایضاً، ج:6، ص:158۔

20. قال عمرؓ بن الخطاب: "لو استقبلت من أمری ما استدبرت لأخذت فضول أموال الأغنیاء، فقسّمتها علٰی فقراء المهاجرین.

(المحلی، ج:6، ص: 158، و کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف، ص 50، طبع: بیروت۔)

21۔ وصح عن ابی عُبیدة بن الجراحؓ و ثلاث مائة من الصّحابة رضی اللّٰه عنهم أنّ زادهم فنی، فأمرهم ابو عبیدة، فجمعوا أزوادهم فی مزودین، وجعل یقوتهم إیّاها علٰی السّواء.

(المُحلّٰی، ج:6، ص:158۔)

22۔ عن محمّد بن علی بن ابی طالب أنّه سمع علیؓ بن ابی طالب یقول: "إنّ اللّٰه تعالٰی فرض علٰی الأغنیاء فی أموالهم بقدر ما یکفی فقراء هم، فإن جاعوا أوعروا و جهدوا فبمنع الأغنیاء و حقّ علٰی اللّٰه تعالٰی أن یحاسبهم یوم القیامة و یعذبهم علیه." (ایضاً۔)

23۔ و فرض علٰی الأغنیاء من أهل کلّ بلد أن یقوموا بفقراء هم و یدبرهم السّلطان علٰی ذٰلک، إن لّم تقم الزّکوات بهم، و لا فی سائر أموال المسلمین بهم، فیقام لهم بما یأکلون من القُوت الّذی لا بُدّ منهٔ، و من اللّباس للشّتاء و الصّیف بمثل ذٰلک، و بمسکن یکنّهم من المطر، و الصّیف، و الشّمس، و عیون المارّة. (ایضاً۔)

24۔ القرآن 10:90

25۔ و بقیت بقیّة من المال، فقسّمها بین النّاس بالسّویة علٰی الصّغیر و الکبیر، و الحُرّ و المملوک، و الذّکر و الاُنثٰی، فخرج علٰی سبعة دراهم و ثلث لکلّ إنسان. فلمّا کان العام المقبل، جاء مال کثیر هو أکثر من ذٰلک، فقسّمهٗ بین النّاس، فأصاب کُلّ إنسان عشرین درهماً.

(کتاب الخراج، از امام قاضی ابویوسفؒ، ص45، طبع: بیروت۔)

26۔ یا خلیفة رسول اللّٰہ! إنّک قسّمت هٰذا المال فسوّیت بین النّاس، و من النّاس اُناس لهم فضل و سوابق و قدم، فلو فضّلت أهل السّوابق و القدم و الفضل بفضلهم. (ایضاً۔)

27. أمّا ذکرتم من السّوابق و القدم و الفضل، فما أعرفنی بذٰلک، و إنّما ذٰلک شیء ثوابهٗ علٰی اللّٰہ جلّ ثنائهٗ، و هٰذا معاش فالاُسوة فیه خیر من الاُثرة. (ایضاً۔)

28۔ و لمّا رأی المال قد کثر، قال: "لئن عشت إلٰی هٰذه اللّیلة من قابل، لاُلحقن اُخری النّاس بأولٰهم حتّٰی یکونوا فی العطاء سواء. (ایضاً، ص50۔)

29۔ القرآن 32:43۔ 30۔ القرآن 26:13۔

31۔ القرآن 165:6۔ 32۔ القرآن 71:16۔

33۔ القرآن 9:35-34۔ 34۔ القرآن 7:59۔

35۔ القرآن 60:9۔ 36۔ القرآن 43:2۔

37۔ القرآن 73:21۔ 38۔ القرآن 10:63۔

39۔ القرآن 195:2۔

40. کان من مذهب ابی ذرّ رضی اللّٰہ عنه تحریم ادّخار ما زاد علٰی نفقة العیال، وکان یفتی بذٰلک، و یحثّهم علیه، و یأمرهم به.

(تفسیر ابن کثیر، سورہ توبہ (آیت "و الّذین یکنزون الذّهب" کے ذیل میں)

41۔ القرآن 275:2۔ 42۔ القرآن 276:2۔

43۔ القرآن 90:5۔ 44۔ القرآن 83:3-1۔

45۔ القرآن 182:26۔ 46۔ القرآن 29:4۔

47۔ حُجَّةُ اللّٰہ البالغه، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، من ابواب ابتغاء الرّزق، ج:2، ص 273-74، طبع: مکتبہ حجاز، دیوبند۔ 48۔ ایضاً، ص274۔

تجربہ اس بات کا شاہد ہے کہ ''جدید علمی دور'' میں من جملہ دیگر علوم وفنون کے ''علم المعیشت'' کو بھی بڑی حد تک ایک علم وفن کی حیثیت حاصل ہے اور بڑے بڑے علمائے یورپ وایشیا نے اس پر ضخیم تصانیف پیش کی ہیں، لیکن اس تمام این وآں اور چنیں و چناں (بحث ومباحثہ) کے باوجود ''علم المعیشت'' کا اصل مقصد __ یعنی عام رفاہیت (آسودگی) و خوش حالی __ آج تک عنقا بنی ہوئی (ناپید) ہے۔ اور دولت وذرائع دولت سب سمٹ کر ایک مخصوص طبقے کے ہاتھ میں اس طرح آ گئے ہیں کہ عام انسانی آبادی کے لیے زندگی ''موت'' سے زیادہ بھیانک بن گئی ہے۔ بہ خلاف اُس دور __ دورِ نبوتؐ ودورِ خلافتِ راشدہ __ کے، وہاں معیشت کی یہ علمی اور فنی موشگافیاں اگر چہ عنقا تھیں، مگر عام خوش حالی اور رفاہیت کا یہ عالم تھا کہ بلالحاظ مسلم وکافر، مومن ومشرک، مرد و عورت، صغیر و کبیر اور اَجیر و مستاجر (چھوٹا و بڑا اور محنت کش اور اس کو حق محنت ادا کرنے والا) سب ہی امن واطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے اور معیشت میں فارغ البال تھے۔ تاریخ اس بات کا مواد فراہم کرتی ہے کہ:

''اس دور میں ایک وقت مملکتِ اسلامیہ کے اندر ایسا آیا کہ لوگ صدقات کے مال کو لیے پھرتے تھے، مگر اس کا قبول کرنے والا ہاتھ نہ آتا تھا۔''